بھاؤ۔۔۔۔ایک گمشدہ بستی کی روداد

محمد یوسف پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اردو جامعہ پشاور

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین شعبہ اردو جامعہ پشاور

Bhao .... The Story of a lost Hamlet

Mustansar Husain tarr's novel "Bhao" is based on an imaginary hamlet. It was situated on the bank of river Ghagra or Sarsvati. The novel describes the lost civilization of pre Aryan era in sub-continent. According to this novel the first ever civilization of man on earth, was agriculture and the first model of art was utensils, made of clay. Human social and collective life, presented in this novel, is consisted of religious beliefs, social norms, passions and feelings, division of social work etc. it also shows the rituals of marriage and death. In that village polyandry was in practice in which Paroshni has two husbands, Samro and Warchan. Polyandry was an old practice in India, according to Mahabharata; Draupandi was the daughter of king Panachala who was married to five brothers.

The whole life of the village on the bank of river Ghagra revolves around the waters of Ghagra and its seasonal floods, the great waters. The river was not so deep but so wide that the other shore was on the skyline. The next bank was considered a population of dead souls. This river was the source of irrigation of the people of the village. The village has a rich culture and mature civilization where there is agriculture as main profession. There are other professions like making of clay utensils, coins and stamps etc.

With the passage of time the river Ghagra dies down and the people of town leave the village. Even Samro and Warchan also migrate, but Paroshni stands fast and does not leave the village. At the end of the novel she becomes the symbol of life.

Keywords: *Bhao, Sarsvati, Civilization, Sub- Continent, Agriculture, Art, Religious beliefs, Collective life, Social norms*

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "بہاؤ" دریائے گھاگرا یا سرسوتی کے کنارے آباد ہزاروں سال پرانی بستی کی کہانی ہے جو اب مرورِ زمانہ سے معدوم ہوچکی ہے۔ مستنصر نے ناول کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے، جو دراصل رِگ وید مقدس کی آیات ہیں،

"سرسوتی جو بڑے پانیوں کی ماں ہے اور ساتویں ندی ہے۔۔۔۔۔۔

اُس کے پانی آتے ہیں۔۔۔۔۔۔

شاندار اور بلند آواز میں چنگھاڑتے ہوئے۔۔۔۔۔۔" (1)

دریائے گھاگرا یا سرسوتی کبھی صحرائے چولستان میں بہتا تھا۔ روہی یا چولستان ایک وسیع و عریض صحرا ہے۔ یہاں کے لوگ پانی اور چارے کی تلاش میں گھومتے پھرتے خانہ بدوشانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ نہ صرف زندگی کی بنیادی ضروریات کو تلاش کرتے ہیں بلکہ ایک ایسے دریا کو بھی تلاش کرتے ہیں جو ریگستان میں "کھویا ہوا" ہے جس کے مختلف نام ہاکرہ/گھاگرا یا رِگ وید مقدس کا دریائے سرسوتی ہے۔ ان لوگوں کی زبانی تاریخ جو اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری زمینوں میں آباد ہوئے اور بہت کم لوگ جو ابھی تک اس علاقے میں رہتے ہیں اس عقیدے کی تکرار کرتے ہیں کہ ایک دن دریا واپس آجائے گا جو لاوارث دریا کے کنارے دوبارہ اپنے سماج میں زندگی لائے گا۔ مقامی زبانی تاریخ اس حقیقت کو قائم کرتی ہے کہ یہ کبھی آباد، زرخیز زمین تھی۔

ایک پاکستانی مؤرخ، مختیار احمد کا کہنا ہے کہ،

" رِگ وید کی سرسوتی دریا ایک طرح ایک فلیٹ، اتلا اور چوڑا ہے۔ اس کے اوپری حصے کو گھاگرا اور نچلے حصے کو ہاکرہ کہا جاتا ہے۔ یہ موسمی دریا ہوتا تھا"۔(2)

دریائے سرسوتی کے بارے میں ایک وقیع بیان دانینو کا ہے، ان کے مطابق،

"سرسوتی مشرق میں جمنا اور مغرب میں ستلج کے درمیان بہتی تھی اور دریائے سندھ عظیم کے مشرق میں متوازی چلتی تھی۔ یہ سات دریاؤں، یعنی سندھ، جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج کے بنائے ہوئے ماحول کا جزوی حصہ تھا"۔(3)

ہمارے ہاں مدفون شہروں کی دریافت صرف دریائے سندھ ہی کے کناروں سے منسوم کی جاتی رہی، جب کہ کلیانارام نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ خشک اور معدودم ہوچکے دریائے سرسوتی کے کنارے پر بھی ہزاروں آثارِ قدیمہ دریافت ہوچکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ،

" 1930 میں موہنجوداڑو اور ہڑپہ دریائے سندھ اور راوی کے کنارے دریافت ہوئے، غالب خیال یہ تھا کہ یہ علاقہ عظیم وادی سندھ کی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ لیکن بعد کی دریافتوں نے ثابت کیا کہ 2600 آثار قدیمہ کے 80 فیصد سے زائد مقامات دریائے سندھ کے کنارے پر نہیں بلکہ خشک دریائے سرسوتی کے خشک راستے پر تھے۔"(4)

صحرائے چولستان اور ہڑپہ تہذیب کی تشکیل اور ابتدائی خط و خال کے بارے میں ڈاکٹر رفیق مغل کی تحقیق قابل لحاظ ہے، ان کے مطابق، چولستان ہڑپہ تہذیب کی بنیادوں کو تشکیل دیتا ہے، جہاں ابتدا سے ترقی یافتہ مرحلہ تک کی تبدیلی تقریباً 2500 قبل مسیح میں ہوئیں۔۔ ترقی یافتہ ہڑپہ کے زوال کی وجوہات، ڈاکٹر مغل نے یہ بیان کی ہیں،

"معاشی وسائل کی کمی، آبادی کا بڑھتا ہوا دباؤ یا شاید لوگوں کے گروہوں پر حملہ آور ہونے سے پیدا ہونے والی عدم تحفظ ۔ لیکن سب سے اہم متغیر جس کی وجہ سے ڈاکٹر مغل کے مطابق بستی کی نقل مکانی اور ترک کرنا دریا کے راستوں میں تبدیلی ہے، جس نے زرعی زمین اور رزق کی بنیاد کو متاثر کیا" (5)

ان بیانات کی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہے کہ کسی زمانے میں صحرائے چولستان میں گھاگرا یا سرسوتی نامی ایک دریا تھا اور اس کے کنارے ایک بستی آباد تھی جس کی باقیات دریافت کی جاچکی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول "بہاؤ" کے مطابق سرسوتی تہذیب 2500-1700 قبل مسیح سے سندھ اور سرسوتی کی دریاؤں کی وادیوں میں پروان چڑھی۔ دریائے سرسوتی کا خشک ہونا لوگوں کی نقل مکانی کا باعث بنا۔ دریاؤں اور آبادکاری کے ساتھ ساتھ خشک دریا کے کنارے موجود باقیات کے بارے میں آثار قدیمہ کے شواہد آثار قدیمہ کے مختلف طریقوں کے مطابق متعدد وضاحتوں کے تابع ہو سکتے ہیں، یعنی ثقافتی تبدیلی، دریا کی ساحلی زندگی اور خواتین کا عمل اور کردار وغیرہ۔، عورت کی صنفی اور معاشی استحکام اور اجتماعی زندگی کے امکانات، سب اس ناول میں موجود ہیں۔

زندگی اور زمانے ایک ہی خط مستقیم میں نہیں چلتے بلکہ یہ پے در پے تبدیلیوں اور حوادث سے دوچار ہوتے رہتے ہیں ایک تہذیب بچپن سے جوان اور پھر بوڑھی ہو کر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی نئی تہذیب آکر ڈیرے ڈال لیتی ہے۔ کھنڈرات کی جگہ نئی بستیاں تعمیر ہو جاتی ہیں۔ پرانی چیزیں معدوم ہو جاتی ہیں اور نئی چیزیں ارتقا کے راستے پر چل پڑتی ہیں۔ مگر انسان موجود رہتا ہے۔ اور ہر طرح کے حالات و حادثات کا مقابلہ کرتے ہوئے نئی تہذیبوں کی داغ بیل ڈالتا رہتا ہے۔ فطرت اور فطرت کے مصائب سے ہر لمحہ جنگ، پرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب، کھنڈرات کی جگہ نئی عمارات اور پرانی کی جگہ نئی چیزوں کی دریافت، یہ سب حضرتِ انسان کی اختراعی اُپج اور پیہم جدوجہد کا کرشمہ ہے۔ انسان کی یہی کرشماتی اُپج ہی تارڑ کے اس ناول کا موضوع ہے۔

اس ناول میں حیرانی کی بات، مستنصر حسین تارڑ کا توانا اور رسا تخیل ہے جو پانچ ہزار سال قبل کی تہذیب اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔ ناول کا قاری اس قدیم اور تصوراتی تہذیب کو اجنبی اور اُوپرا نہیں سمجھتا بلکہ اپنے آپ کو اسی ماحول کا زندہ اور چلتا پھرتا باشندہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ ناول کے جیتے جاگتے کرداروں کے ساتھ گھل مل کر اُن کے دُکھ سُکھ کا ساتھی اور خوشی کا شریک بن جاتا ہے۔ بہاؤ کا قاری فضا اور ماحول کو بھی اجنبی محسوس نہیں کرتا۔ اس بستی کی تہذیب و ثقافت اپنی اپنی اور دیکھی بھالی لگتی ہے۔ اس ناول کا کردار اپنی جگہ ایک مکمل اور زندہ کردار ہے، اس کے بڑے کردار تو جیسے ہماری آنکھوں کے سامنے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ بہاؤ میں مردانہ اور زنانہ کرداروں میں ہر طرح کے لوگ سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس ناول میں کرداروں کے نام اور اُن کے معاشرتی منصب اور حیثیت اور ساتھ ساتھ ان کے پیشوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

پاروشنی ایک سمجھ دار اور زراعت پیشہ عورت ہے جو اس ناول کی جان ہے۔ تارڑ نے اس کو زرخیزی، روئیدگی، امید اور زندگی کی علامت بنا دیا ہے۔ پکلی ایک دست کار عورت ہے جو آرٹ اور جمالیات کا ذمہ دار کردار ہے۔ یہ مٹی کے برتن بناتی ہے اور بستی کی عورتوں کا ہار سنگار کرتی ہے خاص کر ان کی

شادی کے موقع پر پکلی دلہنوں کے جسموں پر گل بوٹے بنا کر ان کو خوبصوت بناتی ہے۔ ورچن ایک سیاح ہے جو موہنجوداڑو اور ہڑپہ، جس کو وہ ہری یوپیا کہتا ہے، کا چکر لگاتا ہے پھر واپس اپنی بستی آتا ہے اور پکی اینٹوں کا خیال ساتھ لاتا ہے۔ سمرو ایک کاشت کار ہے جو پاروشنی کے ساتھ مل کر کنک کی کاشت کرتا ہے اور بڑے پانیوں کے آنے کا انتظار کرتا ہے۔ یہ فن کار بھی ہے اور سکے، زیور اور مہریں بناتا ہے۔ دھرو امذہبی پیشوا کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ "مانا" کو دیوتا مانتا ہے اور اس کے نام کے بیلوں کو "زیبو" یعنی مقدس بیل سمجھتا ہے۔ یہ ان بیلوں کی سخت قحط میں بھی رکھوالی کرتا ہے لیکن سخت ترین بھوک کی حالت میں انہی "زیبو "بیلوں کا گوشت کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔۔ماما ماسن ایک درویش ہے ساری زندگی فقیرانہ طور پر گزارتا ہے اور آخر کار سب کچھ ترک کر کہ درختوں میں پناہ لیتا ہے۔ گا گری اور چیوا میاں، بیوی کی حیثیت سے رہتے ہیں اور گاؤں والوں کی خدمت کرتے ہیں۔ ان سب جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے ہم اس قدیم زمانے کی سماج، تہذیب اور نفسیات کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس ناول کی اہم خصوصیت اس میں پیش کردہ تہذیب اور ثقافت ہے جو اس ناول کے کرادر مصنوعات کے ذریعے آئندہ زمانوں کے لیے محفوظ کر لیتے ہیں۔ جیسے برتنوں پر اس وقت کا فن کار (پکلی) پُھول اور بیل بُوٹے بناتا ہے اور سمرو سکے اور مہریں بناتا ہے تو اس کا مقصد اپنے فن اور تہذیب کو آنے والے لوگوں کے لیے محفوظ کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں اُن مصنوعات کو اپنے آبا کی یادگار سمجھ کر میوزیم میں سجا سکیں۔

"بہاؤ" میں گھاگرا یا سرسوتی کے کنارے آباد زمین اور زندگی کو بے یقینی کے عالم میں چھوڑنے کی اس وقت کی اذیت جب، مذہبی عقائد سے لے کر زندگی کے مادی حالات تک، زندگی کا پورا نمونہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا، یہی اذیت ناول بہاؤ کا موضوع ہے۔ بہاؤ میں انسانی زندگی کی کہانی دریا کے ارد گرد گھومتی ہے اور یہی دریا بستی والوں کی زندگی کا وسیلہ بنتا ہے۔ اور عورت بطور خاص پاروشنی زندگی کے تسلسل اور زرخیزی کی ذمہ دار بھی ہے اور علامت بھی ہے۔ پاروشنی جو گھاگرا یا سرسوتی کے کنارے پر ایک بے نام سماج میں رہتی ہے وہ خود "بستی" ہے۔ پاروشنی ایک منفرد کردار ہے جس کی اردو ادب میں کوئی مثال نہیں۔ بہاؤ کے فلیپ پر عبداللہ حسین نے پاروشنی کے بارے میں لکھا ہے کہ

"اردو فکشن میں اس سے زیادہ زوردار نسوانی کردار مشکل سے دستیاب ہو گا"(6)

ایک عورت جو اپنی نسائی طاقت سے آگاہ ہے لیکن جدید دور کے حقوق نسواں اور نسائی شعور رکھنے والیوں سے بہت مختلف ہے تارڑ نے اس کا سراپا یوں بیان کیا ہے،

"پاروشنی اپنی نسل کا خاص قدبت لیے ہوئی تھی۔ ہلکا سیاہی مائل رنگ، گھنگریالے اور بھورے بال جو ایک ستھرے گھونسلے کی طرح سر پر رکھے ہوئے تھے۔ بھویں اوپر کو اٹھی ہوئیں، ناک چوڑی مگر اونچی، جبڑا ذرا آگے کو نکلا ہوا جیسے بھوکے جنور کا ہوتا ہے، قدبت ایسا کہ کنک کی فصل میں چلتے ہوئے پہلی نظر پر دکھائی نہ دے اور سروٹوں میں گم ہو جائے۔ ہونٹ موٹے اور بھرے بھرے۔ اور کُولہے پھنیر سانپ کے پھیلے ہوئے پھن کی طرح۔"(7)

پاروشنی اس ناول کا سب سے زیادہ مضبوط اور جاندار کردار ہے۔ اس کردار کے بارے میں اقبال خورشید نے ایک انٹرو میں تارڑ سے اس کردار کے بارے میں سوال کیا،

اقبال: بلاشبہ، پاروشنی اردو فکشن کا مضبوط ترین نسوانی کردار ہے۔ یہ خالصتاً تخیل کی پیداوار ہے، یا سیاحت کے دوران اُس پری وش سے سامنا ہوا؟''

تارڑ: دراصل پاروشنی ایک ایسی لڑکی تھی، جو بہت خوب صورت تھی۔ میرے اور اُس کے درمیان جذباتی رشتہ یا اور محبت کا رشتہ تھا۔ پاروشنی اسی کا سراپا ہے۔ چال ڈھال، جسمانی خطوط میں نے وہاں سے لیے، مگر میں اسے پانچ ہزار سال پیچھے لے گیا "(8)

پاروشنی کے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں، اس کو ماتی نامی ایک عورت نے پالا۔ جب ماتی کا شوہر مر جاتا ہے تو وہ سات دن سات راتیں دریا سے باتیں کرتی ہے اور واپسی پر سروٹوں میں کسی بچے کے رونے کی آواز سن کر اسے اٹھا لیتی ہے اور کہتی ہے کہ پانی زندہ ہوتے ہیں اور انہی نے اسے جنم دیا ہے اور اب میں اس کو پالوں گی۔ ایک راہگیر نے اس کو نام دیا۔ اس کے مطابق ہری یوپیا پاروشنی دریا کا کے کنارے آباد ہے۔ چونکہ اسے دریا نے جنم دیا ہے اس لیے اسے پاروشنی کہو، اس طرح وہ گھا گرا کی بیٹی تھی۔

وہ ورچن اور سمرو دونوں سے پیار کرتی ہے اور دونوں کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھی ہے۔ اس سلسلے میں ذرا سی الجھن کا شکار رہتی ہے کیونکہ، اس کے اندر سے کوئی پکا سندیسہ نہیں آتا کہ اس کو کون چاہیے۔ تارڑ نے لکھا ہے،

"ورچن یا سمرو۔۔ سمرو یا ورچن۔۔ کس کے دیکھے سے اس کا پنڈا ہولے سے تپتا ہے اور بیچ میں وہ نرم ہوتی تھی۔ کس کے دیکھے سے۔۔۔ اور وہ فرق نہ کر سکی۔ یوں تو اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو فرق کرتی بھی نہ دونوں کو دیکھ لیتی، دونوں اس کے گھر والے ہو جاتے اور ایسا ہوتا چلا آرہا تھا پر پاروشنی فرق کرنا چاہتی تھی۔"(9)

بستی میں پولینڈری عام نہیں تھی، مگر موجود تھی۔ کثیر شوہری کی یہ روایت مہابھارت میں بھی موجود ہے۔ پنچال کے راجہ روپیڈ کی بیٹی "دروپدی " پانچ پانڈو بھائیوں سے بیاہی گئی تھی۔ پاروشنی کا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے بہت اشتیاق ہوتا ہے کہ معلوم کرے کہ بچہ کی ناک کس پر گئی ہے؟ سمرو پر یا ورچن پر؟ مگر وہ روتا نہیں یعنی وہ زندہ نہیں ہوتا اور وہ سیاہ رات کی تاریکی میں بچہ کو دریا میں پھینک دیتی ہے۔ زمانوں بعد وہ سمرو سے کہتی ہے،

"۔۔۔۔۔۔اور آج میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم دونوں جاننا چاہتے ہو کہ وہ جو رویا نہ تھا کس کا تھا تو مجھے خود نہیں پتہ کہ وہ تم دونوں میں سے کس کا تھا تم دونوں برابر کے باٹ ہو"(10)

اس واقعہ سے اس کی زندگی بہت بدل جاتی ہے جیسے وہ خود بھی بچہ کے ساتھ پانیوں میں کہیں غرق ہو گئی تھی۔ ناول کے آخر میں وہ سمرو کے ساتھ بیٹھی، گئے زمانوں کو یاد کرتی ہے اور کہتی ہے،

"۔۔۔۔۔ تو میں تمہیں بتاؤں کہ اسے پانی میں ڈالنے کے بعد میں خود بھی پانی میں گئی اور اب میں جو ہوں وہ ہوں جس پر بہت سارے برس بیت گئے ہیں تو میں ویسے کیسے بن جاؤں جیسے کہ تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسے ورچن کہتا تھا کہ میں اس بڑے جُثّے کا ایک حصّہ بن جاتا ہوں جو یہ سب کچھ ہے تو میں بھی ایسے ہو چکی ہوں۔ فرق صرف یہ ہے

کہ وہ اس زمین سے الگ ہو جاتا ہے پر میں جُڑ چکی ہوں اور اب میں آسمان ، مٹّی تارے اور پانی ہوں اور کچھ نہیں۔"(11)

اور واقعی پاروشنی زمین سے جُڑ جاتی ہے اور جب دریا کے مکمل سوکھ جانے پر سب جانے لگتے ہیں تو وہ سمرو سے حاملہ ہو کر ویران بستی میں اکیلی رہ جاتی ہے، تھوڑے سے کنک کاشت کے لیے رکھ چھوڑتی ہے اور تھوڑے سے کھانے کے لیے پیسنے لگتی ہے۔اور ساتھ ساتھ زندگی کی صدا"ہوؤ دھم"بلند کرنے لگتی ہے۔اوراس طرح پاروشنی کا کرداراس ناول میں امید، زرخیزی اور زندگی کی علامت بن جاتا ہے۔

ورچن ایک سیلانی مزاج شخص ہے جو بستی سے کہیں چلا جاتا ہے۔بقول تارڑ،

"وہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔جیسے ساری بستی پانی کے دنوں میں بیٹھ جاتی ہے اور لوگ سوتے ہیں کھاتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔وہ چلنا پھرنا چاہتا تھا اور تبھی وہ پانی کے دنوں میں بھی باہر نکل جاتا۔اس کے تلووں میں کھجلی تھی جو اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔"(12)

بستی میں واپس آکر کئی دنوں تک خاموش رہتا تھا...اور ایک دن خاموشی توڑتے ہوئے پاروشنی سے کہتا تھا،''دیکھو پاروشنی، جنگلوں، جانوروں اور پانی بھی سانس لیتے ہیں۔ہماری طرح اوران کی بھی زندگی ہے... لیکن ان کے پاس حرکت کرنے کی آزادی نہیں ہے، پھر ہم جو حرکت کر سکتے ہیں ہمیں کسی جگہ جامد نہیں بیٹھنا چاہیے... ہمیں حرکت کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے دیکھنے کو بہت کچھ ہے اور میں اپنی بستی سے آگے دیکھنا چاہتا ہوں۔اور پاروشنی اسے دانشورانی انداز میں سمجھاتی کہ تو یہ بھی دیکھ کہ جانور اپنے چارے کی جگہ سے دور نہیں جاتے، درخت اور بوٹے اپنی زمین ہی میں ہرے بھرے رہتے ہیں۔تو کیا ضروری ہے کہ بندہ چلے پھرے۔نہیں ورچن۔ہم، جانور اور بوٹے سب پاس رہیں تو جیتے ہیں اگر کوئی دور چلا جائے تو اوروں کی سانسیں کم ہو جاتی ہیں۔مگر ورچن پھر بھی دور کی دنیاؤں کی سیر کو چلا جاتا ہے۔ وہ موہنجودڑو اور ہڑپہ جاتا ہے ۔وہاں وہ آریہ قوم کے افراد سے ملتا ہے اور ان سے تبادلۂ خیال کرتا ہے اور کئی نئی چیزوں سے آشنا ہو جاتا ہے۔وہاں وہ خود کو گروی رکھے ہوئے بھٹہ خشت پر کام کرنے والے مزدو دیکھتا ہے۔ان مزدوروں کو بدترین استحصال کا سامنا ہے،

"بھٹّے والوں کا ڈھنگ عجیب تھا، وہ اَن پانی دیتے اور رہنے کو چھپر دیتے اور پورا بال بچہ اور بڑے بوڑھے کام میں جتے رہتے، سویر کرتے اور شام کرتے اور اتنا کام کرتے کہ ان کی ہڈیاں بڑی شتابی سے ڈھیلی اور نرم ہو جاتیں۔اور اَن پانی بھی نِرا اتنا ملتا جس سے سانس آتا جاتا رہے اور بس۔اور بھٹّے کا کام کاج بڑا کھٹن تھا، رَت کو نچوڑ کر اس کی سرخی کو کالک میں بدلنے والا کام۔"(13)

ان مزدوروں میں ایک شخص ڈوگا بھی ہے، جو ورچن کی واپسی میں اس کے ساتھ بھاگ آتا ہے اور گھاگرا بستی میں پکی اینٹوں کا آغاز کرتا ہے۔
موہنجودڑو میں ورچن کو پورن ملتا ہے جو قبضہ گیر آریہ نسل سے ہے۔ورچن اور پورن کی باتوں سے تارڑ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ آریہ نسل کے ساتھ مقامی نسل کبھی بھی کھل مل نہ سکے گی۔چنانچہ ایک موقع پر پورن اس سے کہتا ہے کہ ہمارا رنگ بھی تم لوگوں کی طرح ہو جائے گا، میں یہاں کی کسی عورت میں اپنا بیج بو دوں گا اور ہم ایک ہو جائیں گے۔ورچن جواب میں کہتا ہے،

"کبھی نہیں۔۔۔۔۔۔۔تم باہر والے ہو اور باہر والے ہی رہو گے۔ تمہارا رنگ مٹّی ایسا کبھی نہ ہو گا۔ تمہاری ناکیں ہمارے کھیتوں اور پانیوں کی باس سے اونچی ہی رہیں گی۔ تم کبھی نہیں جانو گے کہ کنک کے سٹّے میں پہلا دانہ پڑے تو وہ کیسے مہک کر اپنے آنے کا بتاتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ تم نے ہمارے موہنجو کو کیا سے کیا کر دیا ہے؟ یہ کیا تھا اور اب کیا ہے؟" (14)

ورچن واپس اپنی بستی میں آ کر کاشت کاری کرنے لگتا ہے مگر خشک سالی اور گھاگرا کے سوکھ جانے کی وجہ سے بستی چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ سمرو زیور اور مہریں بنانے والا ایک کاریگر ہے جو پتھروں اور درختوں اور بوٹوں سے زیورات اور مہریں بناتا ہے۔ وہ خود آگاہ شخص ہے اور اپنے فن کی انفرادیت خوب جانتا ہے۔ سمرو انگوٹھے اور انگلی میں بھنچے پیپل کے پتّے ایسی شکل سے سفید منکے کو دیکھ کر خود کہتا ہے کہ اسے سمرو نے بنایا ہے اور انتہائی محنت سے بنایا ہے۔ زیور بنانے کا فن اور اس کی شکلیں کہاں سے آتی ہیں؟ وہ خود اس بات پر غور کرتے ہوئے کہتا ہے،

"میں نے کتنے سانس روک کر سوئی کی مدد سے آگ پانی کے ساتھ سیاہ شکلیں بنائیں۔ یہ کس کی شکلیں ہیں۔ یہ کیا صورتیں ہیں جو میں ان پتھر۔ مٹّی اور سونے چاندی کے منکوں اور چوکور مہریوں پر بناتا ہوں۔ یہ کہاں سے آتی ہیں۔۔ یہی شکلیں، یہی مورتیں اس بستی میں کب سے بنتی آئی ہیں، جب سے میں ہوں جب سے میرا بیج اس زمین میں اگا۔ لیکن میرا بیج سب سے پہلے پہل اس زمین میں کس نے اگایا۔ پہلا کون تھا۔۔اسے کون لایا۔۔اسے یہ مورتیں کس نے سکھائیں۔۔" (15)

سمرو حال اور ماضی کے رشتے کو جوڑتے ہوئے مستقبل کے بارے میں بھی سوچ رکھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ جب میری سانسیں باہر ہو کر دریا پار ہو جائیں گی اور میں ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو جاؤں گا تو پھر میرے اس فن کا رکھوالا کون ہو گا، کون یہ سب چیزیں بنائے گا؟ میری بنائی ہوئی چیزیں اور زیورات اس بستی میں رہیں گی یا میرے ساتھ دفن ہو جائیں گی؟ پھر جب بے انت زمانے بیت جائیں گے، تو ہو سکتا ہے کہ یہ سورج، دریا اور یہ بستی اسی طرح ہوں اور گھاگرا کے بڑے پانی آنے سے پہلے کوئی زمین کھود رہا ہو اور اسے میری طرح دبا ہوا یہ منکا مل جائے۔ تو وہ کون ہو گا؟ اسے کیسے معلوم ہو گا کہ میں نے یہ منکا بنانے میں کتنے پسینے بہائے ہیں اور اس کے لیے میں کتنا دھوپ میں جلا ہوں، اسے کیسے معلوم ہو گا یہ منکا سمرو نے بنایا ہے؟

چیوا ایک چرواہا جو بستی سے باہر کہیں رہتا ہے اور بستی کے مکینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ گاگری اس کی بیوی ہے جو بھوکڑ کا شکار کرتی ہے اور بستی والوں کو گوشت کا سواد فراہم کرتی ہے۔ وہ اس بھوکڑ مارنے کے فن میں تاک ہے اور کوئی بھوکڑ اس کے وار سے نہیں بچ سکتا۔ مگر جب اس کا بچہ مر جاتا ہے تو وہ بہت رحم دل بن جاتی ہے اور یہ بھوکڑ کا شکار کرتی ہے تو پہلی بار اس کا وار خطا جاتا ہے کیونکہ وار کے عین آخری لمحے اسے بھوکڑ اپنا کھویا ہوا بچہ لگ جاتا ہے۔

"۔۔۔جب ڈنڈا بھوکڑ کے سر پر تھا اور وہ اپنے پروں کو سمیٹتی اپنے آپ کو بچانے کو بھاگتی تھی تب شاید اُس کے بھاگنے میں کچھ تھا جو گاگری کے اندر گیا اور وہاں دُہائی دی کہ مت مارو۔۔۔۔ مت مارو۔۔۔اور اس نے جان بوجھ کر ہاتھ روک لیا تھا۔" (16)

دھروا ایک صحت مند آدمی تھا اور ناگری اس کی زوجہ تھی وہ ہر سال اس سے حاملہ ہو جاتی اور ہر سال اس کا اسقاطِ حمل ہو جاتا۔

"جیسے بیج میں سے کونپل پھوٹے اور پھوٹتے ہی جھلس جائے۔ کئی برس تک یہی ہوا۔اور پھر وہ گھاس پھونس ہونے لگا، کبھی کچھ ہو جاتا اور اکثر کچھ نہ ہوتا اور یہ وہی دن تھا جب وہ بالکل رہ گیا تو ناگری نے اسے کہا تھا، دھروا اب تو گھاس پھونس ہو گیا سروٹ ہو گیا، مرد نہ رہا۔اور وہ اٹھ کر چلی گئی اور پھر نہیں آئی"(17)

دھروا جب وظیفۂ زوجیت کے قابل نہ رہا تو مذہبی ہو گیا۔ وہ "مانا" کے کوہان کے بغیر بیلوں کی رکھوالی کرنے لگا جنہیں وہ "زیبو" بیل کہتا، جو مقدس تھے اور کھیتوں میں مشقت کے لیے نہیں تھے۔ وہ ان بیلوں کا پیشاب اور لید صاف کرتا اور اپنے تئیں مطمئن تھا کہ وہ ایک مقدس فرض سرانجام دے رہا ہے۔ اب "زیبو" بیل اس کی کل حیاتی کا اثاثہ بن جاتے ہیں، اور جب بھوک عام ہو جاتی ہے اور لوگ بھوکوں مرتے ہیں تو دھروا خود بھوکا رہتا ہے مگر "مانا" کے "زیبو" بیلوں کے لیے کہیں نا کہیں سے چارا ڈھونڈ کر لے آتا ہے۔ مگر جب بھوک حد سے بڑھ جاتی ہے اور "زیبو" بیل بھی مرنے لگتے ہیں، اس موقع پر بھوک تہذیب کے آداب تو مٹا دیتی ہے مگر ساتھ مذہبی جوش و جنوں بھی کافور کر دیتی ہے۔ باڑے میں مردہ بیلوں کی بُو نا قابل برداشت ہو جاتی ہے اور ایک بیل تازہ مرتا ہے دھروا لوگوں کو بلا کر اسے باہر کھینچ لاتا ہے اور ایک پتھر سے اسے چیر دیتا ہے کہ اسے کوّے اور گدھ کھا لیں۔ لوگ سخت بھوک کی وجہ سے اس بیل کے کھانے کا کہتے ہیں تو دھروا انہیں منع کرتا ہے کہ زیبو بیل کو نہیں کھاتے، یہ تمہیں کھا جائے گا، میں کہہ رہا ہوں۔ مگر بھوکے لوگ پہلے تو جھجکتے رہے پھر سب مذہبی ڈر اور خوف بھلا کر اس مقدس بیل کو کھانے لگتے ہیں تو دھروا منہ پرے کر کے کہہ دیتا ہے کہ میں بھی بہت دن سے بھوکا ہوں۔ یا تو وہ حد درجہ مذہبی ہوتا ہے یا بستی کی ویرانی اور بھوک سے موت کی فراوانی دیکھتا ہے تو لادین بن جاتا ہے۔ آخر میں ڈور گا ایک بیل کو لینے آتا ہے تو دھروا کو شک ہوتا ہے کہ بیل ابھی مرا نہیں سانس لیتا ہے پھر وہ پتھر کے مقدس لنگ کے ایک ٹکڑے کو اٹھا کر تعظیماً آنکھوں سے لگایا:

"اور پھر پھینک دیا۔۔۔۔۔۔۔جو لنگ مینہ نہ برسائے وہ کس کام کا۔۔۔۔۔۔اور ویسے ہی بیل۔۔۔"(18)

پکلی ایک فن کار خاتون ہے جس کا فن مٹّی کے برتن بنانا اور عورتوں کے جسموں پر گل بوٹے بنانا ہے۔ بستی کے بائیں بازو کے آس پاس کہیں اس کا آوا تھا جس میں وہ گھڑے، صحنک، جھجھر، ڈول، چاٹیاں، دیگر برتن اور مردوں کی لاشوں کے لیے مرتبان بناتی تھی۔ وہ سبز ٹہنی کا سرا کوٹ کر نرم کرتی اور اس سے برتنوں پر گل بوٹے، مچھلی، پیپل کے پتے، درخت اور پرندوں کی شکلیں بناتی۔ اپنے فن کے بارے میں بتاتی ہے کہ یہ بیل بوٹے میرے سر میں نہیں، ٹہنی میں ہوتے ہیں اور برتنوں پر بن جاتے ہیں۔ گیرواس کا مرد ہے جو اکثر سویا پڑا رہتا ہے۔ پاروشنی کہتی ہے کہ اس سے بھی کام کاج لیا کر تو پکلی ایسا دانشورانہ جواب دیتی ہے جو آج کی فیمنزم کی بھاری آواز کی طرح لگتی ہے۔

"مانا نے عورت ذات کو زیادہ زور دیا ہے، زیادہ بُوجھ دی ہے۔ مہامیّا بھی تو عورت ہے"(19)

پندو اور سُکرا، پکلی کے دو بچے تھے جو اپنے کھیلنے کے لیے بیل گاڑی بنا کر ماں کے آوے میں رکھ دیتے جس میں برتنوں کے علاوہ بُت اور منکے بھی رکھے ہوتے۔ پکلی گاؤں والوں کے لیے برتن بناتی ہے اور وہ فصل پکنے پر اسے دانے دیتے ہیں گویا بستی میں بارٹر سسٹم چل رہا ہے۔ بستی میں جس لڑکی کی پہلی شادی ہوتی تو پکلی اس کا خوب ہار سنگار کرتی۔ جب ورچن موہنجو سے واپس آتا ہے تو کچھ عرصہ کے بعد اس کی اور پاروشنی کی شادی ہوتی ہے۔ اس موقع پر پکلی اس کے جسم پر ویسے ہی بیل بوٹے بناتی ہے جو وہ اپنے برتنوں پر بناتی ہے، اور پاروشنی سے کہتی ہے کہ تو جب تیار ہو جائے گی

تو دور سے جھجھر لگے گی۔۔۔۔ پھر پکلی اس کے بال دھو کر سکھا لیتی ہے اور اس میں صندل کی لکڑی دھونی دے کر اس میں کنگھی کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرما لگاتی ہے۔ باقی سنگھار کے لیے اسے خود کہتی ہے، پکلی کے تھڑے پر سارے زیور پڑے ہوتے ہیں، ناک کا پوپا، پاؤں کی کڑیاں، موتے، کنگن اور چھلے، گلے کی ہنسی اور بازو پر باندھنے کی مہریں۔

آقا اور غلام کی دہقانی یا غلامی کی مثال ڈورگا کا کردار ہے جو استحصال، جبر اور پسماندگی کی علامت ہے۔ دورگا کے ماں باپ نسل در نسل بھٹہ میں غلامی کرتے آرہے ہیں۔ ڈورگا کی پیدائش بھی بھٹہ میں ہوئی اور وہ پیدائشی غلام بنا۔ وہ بچپن ہی سے کام میں جُتھ گیا اور جلد ہی اسے بچوں والے کام سے نکال کر بڑوں والے کام پر لگا دیا گیا جسے کرنے کے لیے اس میں جسمانی طاقت نہ تھی۔ کم کام کرنے کی وجہ سے اس کی خوراک آدھی کر دی گئی اور اس نے رو رو کر مالک سے کام بدلنے کی التجا کی اور گارا کھودنے کی بجائے سانچے بھرنے لگا۔ ڈورگا اور اس جیسے بہت سے لوگ بھٹہ کی چار دیواری ہی کے اندر کام کرتے اور باہر نہ نکلتے۔ رفتہ رفتہ اس کی کمر جھک گئی اور جب ورچن واپس اپنی بستی جا رہا تھا تو یہ بھی چھپکے چھپکے اس کے پیچھے موہنجو سے فرار ہو کر بستی آتا ہے۔ یہاں وہ اپنے استحصال کو یوں بیان کرتا ہے،

> "اس سے پہلے میرے لیے سب لوگ جھکے ہوئے تھے اور کام کاج میں نچڑتے ہوئے بس۔۔۔۔۔ جب رات پڑتی اور ینٹیں دکھائی نہ دیتیں تو یہ سب اَن اندر ڈال کر بے سدھ پڑتے اور سویر منہ اندھیرے ویسے ہی جھک جاتے۔۔۔۔ میں نے انہیں کبھی چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اور ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا۔ اور جب باہر کے لوگوں کو ایسے دیکھا تو اچنبھا ہوا کہ لوگ ایسے بھی زندگی کرتے ہیں۔" (20)

ڈورگا بستی والوں کے ساتھ گھل مل جاتا ہے اور یہاں پکلی کے آوے میں پکی سرخ اینٹیں بنانے لگتا ہے اور کچھ عرصے بعد اس کا دوسرا شوہر بن جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے بہاؤ میں مادر سری سماج پیش کیا ہے جس میں سب اہم کام عورتوں کے ہاتھوں میں ہیں، مرد یا صرف افزائش نسل کے لیے ہیں یا کھیتی باڑی کے لیے۔ سمرو دست کار اور ورچن سیاح ہے باقی تقریباً سارے مرد معمولی کاموں میں جتھے ہوئے ہیں۔ یہاں سماجی طور پر عورت مرد سے افضل سمجھی جاتی ہے اس بات کا اظہار پکلی پاروشنی سے کرتی ہے کہ ماتا نے عورت کو زیادہ طاقت ور اور عقل مند بنایا ہے، مرد کا کام صرف بچے پیدا کرنا یا کھیتی باڑی کرنا ہے۔ کواسی گاگری کی بڑی بہن ہے جو آلکس اور سستی کا شکار ہے۔ چٹائی پر پڑی رہتی ہے اسے کوئی کام نہیں بس ایک ہی کام ہے پیٹ بھرنا یا پیٹ خالی کرنا۔ اس کی دوبارہ شادی ہوتی ہے اور نباہ نہ ہونے کی صورت میں اس جیسی نکمی عورت بھی مرد کو گھر سے نکال باہر کرتی ہے۔ بستی میں پولینڈری نظام کہیں کہیں موجود ہے جس میں ایک عورت کے ایک سے زیادہ شوہر ہوتے ہیں۔ پاروشنی بیک وقت سمرو اور ورچن کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہے۔ پکلی کا ایک شوہر گیر وہے اور جب دورگا موہنجو سے ورچن کے ساتھ آکر پکلی کے آوے میں اینٹیں بنانے لگتا ہے اور بعد میں پکلی اسے بھی شوہر بنا لیتی ہے۔

بستی تقسیمِ کار کے اصولوں پر چلتی ہے جس میں اہم کام عورتوں کے سپرد ہیں۔ پاروشنی اپنی جھجھر سے بستی والوں کے لیے پانی بھر کر لاتی ہے، گاگری ایک مشّاق شکارن ہے جو بھوکڑ کا شکار کرتی ہے اور بستی والوں کے کام ودہن کے ذائقے کے لیے بندوبست کرتی ہے۔ پکلی کا آوا ہے جس میں وہ مٹّی سے مختلف برتن بناتی ہے اور ساتھ ساتھ نئی دلہنوں کا ہار سنگھار بھی کرتی ہے۔ ماتی بچوں کو پالتی ہے۔ میّا اپنے بیٹے کے ساتھ بیل گاڑی چلاتی ہے۔ فصل کے پک جانے پر خدمات کے عوض دانے دیے جاتے ہیں۔

بستی کے لوگوں میں مذہبی عقائد بھی پائے جاتے ہیں۔ بستی میں جب کسی کی موت واقع ہوتی ہے تو بستی والے کہتے ہیں کہ اس کو یَم کے کتے لے گئے ہیں۔ مردوں کو پکلی کے بنائے ہوئے مٹّی کے مرتبانوں میں رکھ کر دفنایا جاتا تھا۔ گاگری نے اپنے نومولود بچے کی موت کے بعد ایسا ہی کیا۔

"۔۔۔۔اُسی چیوا کا بیج اس نے پالا، پر جب وہ باہر آیا تو جہاں اس کا ناک منہ چاہیے تھا وہاں بھی ماس تھا۔ ناک منہ کی شکل ہی نہ تھی تو وہ سانس کہاں سے لیتا، مر گیا اور گاگری نے اسے ایک چھوٹے سے برتن میں دبا آئی اور پتھروں کے راستے میں ایک چھوٹا سا پتھر بھی رکھ آئی۔"(21)

عقیدہ تھا کہ دریائے گھاگرا کا دوسرا کنارہ روحوں کی آماجگاہ ہے اور یَم کے کتے لوگوں کو وہاں لے جاتے ہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔ مذہبی عائد کے ہمراہ ان میں کچھ توہمات بھی عام تھیں۔ مثلاً جب گھاگرا میں پانی نہیں آتا تو پکلی کہتی ہے،

"۔۔۔۔۔۔۔۔اور مجھے پتہ ہے کہ ادھر گھاگرا کے کنارے ایک کے اوپر ایک گھڑا رکھا جائے۔۔۔۔۔اور ایسے ساتھ ساتھ کہ دور سے وہ ایسے لگیں جیسے بہت سی عورتیں جُڑ کے بیٹھی ہیں گھاگرا کے کنارے۔۔۔۔۔۔۔تو پانی آئیں گے۔۔۔۔۔جب وہ دیکھیں گے کہ گھڑے خالی ہیں اور ان کا انتظار کرتے ہیں تو وہ آئیں گے انہیں بھرنے کے لیے۔۔۔۔"(22)

مذہب اور اس طرح کی توہمات کے پھیلانے کا ذمہ دار اس کے بھکشو تھے جو غیر معمولی فطری یا کائناتی تبدیلیوں کو دریا کی خوشی یا خفگی سے منسوب کرتے۔ جب گھاگرا میں پانی سوکھنے لگتا ہے اور بڑے پانیوں کے آنے کا امکان نظر نہیں آتا تو بھکشو عوام سے دریا کو قربانی پیش کرنے کا یوں کہتا ہے،

"۔۔۔۔۔ مجھ سے پوچھو۔ جو شے تمہیں سب سے بھلی لگتی ہے وہ گھاگرا کو دے دو۔۔۔۔۔۔ دے دو تو یہ مان جائے گا ۔۔۔۔۔۔اور پانی آئیں گے۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا ہوگا۔ میں نے رات اس سے باتیں کی تھیں اسے سنا تھا۔ تم بھی جانتے ہو کہ میں پانیوں کی زبان سمجھتا ہوں۔۔۔۔"(23)

ورچن جب موہنجو جاتا ہے تو وہاں وہ استحصالی اور دہقانی نظام دیکھتا ہے۔ بھٹہ کا مالک صرف کھانے اور چھپر کے عوض لوگوں سے سخت ترین مشقت لیتا اور یہ مشقت صبح سویرے سے شروع ہو کر رات تک مسلسل جاری رہتی ہے۔ مزدور بھٹہ کی چار دیواری میں پیدا ہو کر اسی کے اندر اپنی ساری زندگی گزار لیتے ہیں۔ ناول میں یہ ساری باتیں ڈورگا کی زبانی بتائی جاتی ہیں جو خود بھٹہ کے اندر پیدا ہوا اور ایک لمبی عمر تک سخت ترین مشقت سے گزرا۔ اور جسے اس بات پر حیرت ہے کی اس کے ماں باپ کو اس کا بیج رکھنے کا موقع کیسے ملا کہ بھٹہ میں تو مشقت اور تھکاوٹ سستانے نہیں دیتی۔ ان مزدوروں کے لیے شرائط کار نہایت ظالمانہ تھے۔ بارشوں کے موسم میں نہ گارا بن سکتا ہے نہ وہ سوکھتی ہے اور نہ ہی اس کے لیے بھٹی چڑھتی ہے۔ اس دوران مزدور جو کچھ کھا پی لیتے ہیں مالک اس کو اُدھار میں شمار کرتا ہے اور اس کے عوض مزدور کو دو مہینے مزید کام کرنا ہوتا ہے، اس طرح ہر مزدور مالک کے ساتھ گروی ہو جاتا ہے۔ اور مالک ان کو بتاتا ہے کہ اس سے پہلے تمہاری طرف تین برس ہیں اب تین برس دو مہینے کام کروگے تو حساب پورا ہوگا۔ بقول تارڑ،

"یہ حساب کبھی پُورا نہ ہوا۔ ایک ہزار برس گذر گئے اور پورا نہ ہوا، بچہ پیدا ہوتا اور ابھی اس کا ناڑو نہ کٹتا تو اس پر بوجھ پڑ جاتا کہ اس کے حصے میں اتنے برس اور اتنے مہینے کا کام ہے اور یہ برس اس کے کل سانسوں سے بھی زیادہ ہوتے تو وہ بوجھ کیسے اُتارتا۔"(23)

"بہاؤ" میں آریہ کی یہاں آمد اور یہاں کی زمینوں اور تہذیب و ثقافت پر قبضہ کی روداد بھی قابل توجہ ہے۔

"آریہ کے معنی ''بزرگ'' اور ''معزز'' کے ہیں۔ یہ اُس قوم کا نام ہے جو تقریباً اڑھائی ہزار سال قبل مسیح وسط ایشیاء سے چراگاہوں کی تلاش میں نکلی اور کھلیانوں کو پامال کرتی ہوئی موجودہ پاکستان کی حدود میں وارد ہوئی اور یہاں کے قدیم مہذب قوموں دراوڑ کو جنوب کی طرف دھکیل کر خود ملک پر قبضہ کر لیا۔ آریاؤں کے کچھ قبیلوں نے یورپ کا رخ کیا اور وہاں جاکر آباد ہو گئے۔ آریہ سفید رنگت، دراز قد اور بہادر تھے کردار کی بلندی اور تنظیم کی صفات ان میں موجود تھیں۔ ابتدا میں ان کا پیشہ گلہ بانی تھا جو رفتہ رفتہ کھیتی باڑی میں تبدیل ہو گیا۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دودھ، مکھن، سبزیاں اور اناج عام خوراک تھی۔ میلوں اور تہواروں میں مرد و عورتیں آزادانہ شریک ہوتے تھے۔ سورج، آگ، پانی، بادل اور دیگر مظاہر قدرت کی پوجا یعنی عبادت کی جاتی تھی۔ دیوتا کو خوش کرنے کے لیے جانوروں کی قربانی کا رواج تھا"۔(24)

بہاؤ میں آریہ کی ہندوستان میں آمد اور ان کے مقامی لوگوں کے بارے میں خیالات اور اپنی نسلی برتری کا احساس بھی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ ورچن جب موہنجو جاتا ہے تو آریہ نسل سے تعلق رکھنے والے ایک پُورن نامی شخص سے ملتا ہے۔ دونوں دوست ہیں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں مگر آخر تک ان میں ذہنی اور فکری ہم آہنگی پیدا نہیں ہوتی۔ ورچن اس کے گھوڑے سے ڈرتا ہے کیوں کہ اس کا خیال ہے کہ اگر یہ جانور نہ ہوتا تو یہ اونچی اور ٹھنڈی ناک والے آریہ یہاں نہ آتے۔ پورن کی ماں ہری یوپیا کی تھی اور باپ آریہ تھا۔ جو یہاں کے موسموں سے مطابقت نہ بنا پایا اور واپس چلا گیا۔ پورن بتاتا ہے کہ میں اسی سرزمین کا ہوں اور رفتہ رفتہ میری رنگت تم لوگوں کی طرح ہو جائے گی اور ہم ایک ہو جائیں گے۔ مگر ورچن سخت لفظوں میں اس بات سے انکار کرتا ہے کہ کسی وقت ہم اور ہماری اولادیں ایک ہو جائیں گی۔ ورچن کہتا ہے تمہاری نسل سے پہلے ہم سکھ چین کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ تم آئے اور تمہارے گھوڑوں کے سُموں کی آوازیں ابھی بھی ہمارے کانوں میں ہیں جن سے ہم ڈر جاتے ہیں۔ تم لوگوں نے وہ ہاتھ کاٹ دیئے جو موہنجو کو سنوارتے تھے اس لیے کہ تم ہاتھ سے کام کرنے والوں کو نیچ سمجھتے ہو۔ تمہاری نسل نے وہ موہنجو مٹّی کر ڈالا جو ہزار برس پہلے تھا۔

پورن ورچن کو آریہ کی یہاں آنے کی وجوہات بتاتا ہے کہ تم نکمّے، بودن اور سست ہو۔ تمہاری شکل اور عقل کام کی نہیں۔ کام کم اور سوتے زیادہ ہو۔ اسی لیے ہم تمہیں "پانی" یعنی کنجوس اور چھوٹے دل والے، کہتے ہیں۔ تم دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتے۔ ہم عالی نسل اور خوبصورت ہیں، گھوڑوں پر سفر کرتے ہیں۔ ہم اپنے ساتھ کالی دھات، رتھیں اور زور والے دیوی دیوتا لائے۔ ورچن اسے جواب میں کہتا ہے کہ ہر چیز یہاں کی تھی تم نے نیا نام دے کر اپنا لیا۔ ہمارے دیوی دیوتا، زبان حتیٰ کہ ہمارے دریا جو تم اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، ان کو بھی اپنے نام دیے۔ میں اگر نکما

اور سست ہوں تو کیا کوئی تیز اور خوبصورت بندہ آ کر مجھ سے میرا وہ کھیت زور سے لے لے جو میری زمین پر ہے اور میری ساری نسلوں کی ہڈیوں سے بنی ہے؟

پورن کے خیالات وہ ہیں جو ہندوستان میں انگریزوں کے نوآبادیاتی نظریات تھے۔ جن میں ہندوستانیوں کو نکما، سست اور بطور خاص "بدتہذیب" کہا گیا۔ حقیقت ایسی نہیں تھی ایسی بناوٹی گئی تھی اور ایسا مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے کیا گیا۔ ایسے نظریات میں بقول ڈاکٹر ناصر عباس نیّر،

> "نوآبادکار اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، اپنے سیاسی نظریات، اپنے فنون کے بارے میں جو آرا پھیلاتا ہے۔ وہ نوآبادیاتی دنیا کے افراد کی شخصیت، ثقافت، علم اور فنون کے متعلق موجود آرا کے متضاد اور انہیں بے دخل کرنے والی ہوتی ہیں" (25)

الغرض بہاؤ میں پیش کردہ بستی مستنصر حسین تارڑ کے تیز اور جاندار تخیّل کا کرشمہ ہے۔ پانی کا آدھا بھرا ہوا گلاس اس ناول کا پہلا محرک بنا جس سے تارڑ صاحب کو فکر لاحق ہوئی کہ کیا پانی کم بھی ہو سکتا ہے؟ اور پھر انہوں نے اسی ایک نقطہ کی تلاش و جستجو شروع کی اور 12 سال کے طویل عرصے میں یہ شاہ کار ناول وجود میں آیا۔ دریائے گھاگرا کے کنارے آباد اس بستی کا سارا دار و مدار بڑے پانی پر تھا جس سے یہاں کے کنک کے کھیت زرخیز ہوتے تھے۔ زراعت یہاں کا سب سے بڑا پیشہ تھا۔ رفتہ رفتہ بڑے پانی کا زور کم ہوتا گیا اور کچھ سالوں بعد بالآخر بڑے پانی کی آمد بالکل بند ہو گئی۔ دیائے گھاگرا بھی آہستہ آہستہ سوکھنے لگا اور بستی کا واحد کنواں۔۔۔۔ پاروشنی کا کنواں بھی سوکھ کر کیچھڑ میں بدل گیا۔ زراعت بری طرح متاثر ہوئی اور غذائی اجناس کی شدید قلت ہونے لگی۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے باقی لوگ مجبوراً مقدس بیلوں کا گوشت کھانے لگے۔ بستی کے حالات بد سے بدتر ہونے پر لوگ مہاجرت کرنے لگے۔ بستی جو کبھی سرسبز و شاداب تھی، خشک ریت کا بنجر صحرا بن گئی۔

بستی میں صرف چار لوگ، ورچن، دورگا، سمرو اور پاروشنی رہ گئے جو بھوک پیاس سے بے دم اور تقریباً مردہ ہو چکے تھے۔ ورچن پاروشنی سے بستی چھوڑنے کا کہتا ہے مگر وہ دوٹوک جواب دیتی ہے اور ورچن دورگا کو لے کر بستی سے نکل جاتا ہے۔ بادوں کے مہینے کی سخت گرمی اور خشک ریت پر تیز دھوپ میں سمرو اور پاروشنی رہ جاتے ہیں اور پھر تقریباً مردہ ہو چکے سمرو میں جوانی کا پہلے والا زور پیدا ہو جاتا ہے اور وہ شکر دوپہر میں پاروشنی کو حاملہ کر کے بستی سے نکل جاتا ہے۔ پاروشنی اس حمل سے بچے کی پیدائش کا حساب لگا کر پر اُمید ہے کہ وہ آئے اور پاروشنی دم سادھے اسے سنے گی وہ روئے گا، یعنی وہ زندہ ہو گا، پہلے بچے کی طرح مردہ نہ ہو گا۔

اب خشک ریت کے اس پیاسے صحرا میں صرف پاروشنی رہ جاتی ہے۔ وہ جیسے تیسے اپنے گھر آتی ہے اور کاشت کرنے کے لیے جو کنک سنبھال رکھی تھی اس میں سے کچھ کنک اوکھلی میں پیسنے لگتی ہے اور اکھڑے سانسوں سے "ہوَو۔ دھم" کہنے لگتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ گھاگرا میں پانی کی لشک کبھی نہیں آئے گی اور یہ بستی ہمیشہ کے لیے خشک ریت کا صحرا بن چکی ہے، مگر اس کے باوجود اس کے پاس آدھی مٹھی کنک تھی اور اسے امید تھی کہ اس کے کھیت ہرے ہونے تھے۔

اس طرح پاروشنی افزائش نسل اور زرخیزی کا استعارہ بن جاتی ہے۔

حوالہ جات

1مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص 3

1 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, 2017, P 3

2 Ahmad, M. (2014). Ancient Pakistan: An Archaeological History: Vol IV

Harappean

Civilization. Washington

3 Danino, M. (2010). the Lost River: On the Trail of the Sarswati: Penguin

Books

4 kalyanaram, D. S. (2008). Sarasvat Vedic River and Hindu Civilization.

Sarasvati Research and Educational Trust.

5 Mughal, D. M. (1990). The Decline of the Indus Civilization and the Late

Harappean Period in the Indus Valley. Lahore Museum Bulletin, 1-17.

6 عبداللہ حسین، (فلیپ) بہاؤ، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، 2004

6 Abdullah Husain, (Flap) Bhao, Sang-e-meel Publications, Lahore, 2004

7 مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص 21

7 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, 2017, P 21

8 اقبال خورشید، مستنصر حسین تارڑ سے خصوصی مکالمہ، کراچی: سہ ماہی اجرا، ۲۹ اپریل ۲۰۱۴

8 Iqbal Khurshid, Mustansar Husain Tarr sy Khusosi mukalma, Karachi, seh mahi, Ijra, 29 April 2014

9 مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص 50

9 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 50

10 مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص220

10 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 220

11 مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص177

11 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 177

12 مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص 50

12 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 50

13 مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص26

13 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 26

14 مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص74

14 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 74

مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص41 15

15 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 41

مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص51 16

16 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 51

17مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص237

17 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 237

مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص237 18

18 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 237

مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص17 19

19 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 17

مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص125 20

20 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 125

مستنصر حسین تارڑ، بہاؤر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص40 21

21 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 40

22 مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص247

22 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 247

23 مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2017ء ص76

23 Mustansar Husain Tarr, Baho, Sang- e – meel Publications Lahore, ،2017 Page 76

24 https://ur.wikipedia.org/wiki/آریا وکی پیڈیا، آزاد دائرۃ المعارف

25 ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، نو آبادیاتی صورت حال، مشمولہ، مابعد جدیدیت، اطلاق جہات، بیکن بکس لاہور، 2015، ص368

25 Nasir Abbas Nayyar, Dr, no aabadiati sorat e haal, mashmola, ma baad jadidiat, itlaqi jihat, Beacon books, Lahore, 2015, Page 368

مقالہ نگار: محمد یوسف پی ایچ ڈی سکالر شعبہ اردو جامعہ پشاور

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین شعبہ اردو جامعہ پشاور

عنوان: بہاؤ۔۔۔۔۔ایک گمشدہ بستی کی روداد

صفحات:18

اردو ملخص:

مستنصر حسین تارڑ کا ناول 'بہاؤ' ایک تخیلی بستی کی روداد ہے جو دریائے سرسوتی کے کنارے آباد تھا۔ یہ ناول برِصغیر میں آریاؤں کی آمد سے پہلے کی تہذیب بیان کرتا ہے۔ اس میں تارڑ نے زراعت کو دنیا کا سب سے قدیم پیشہ اور مٹی سے کھلونے اور برتن بنانے کا فن دنیا کا پہلا آرٹ قرار دیا ہے۔ ناول میں پیش کردہ انسان کی سماجی اور اجتماعی زندگی، مذہبی اعتقادات، معاشرتی اقدار، جذبات و احساسات اور تقسیم کار وغیرہ کی آئینہ دار ہے۔ اس ناول میں غمی خوشی کی رسومات بیان کی گئی ہیں۔ اس معدوم ہو چکی بستی میں کثیر شوہری عام تو نہ تھی مگر بہر حال اس کا وجود قائم تھا۔ پاروشنی کے دو شوہر تھے، سمرہ اور ورچن۔

بستی کی تمام زندگی کا انحصار دریائے گھاگرا اور اس کے معاون برساتی پانی پر تھا جسے لوگ 'بڑے پانی' کہتے تھے۔ مذکورہ دریا بہت گہرا تو نہ تھا، البتہ پاٹ دار اور چوڑا تھا۔ یہی دریا بستی کی کھیتی باڑی کے لیے آب پاشی کا واحد ذریعہ تھا۔ بستی کے لوگوں کے مذہبی اعتقاد کے مطابق اس دریا کا دوسرا کنارہ روحوں کی آماجگاہ تھی۔ اس بستی میں توانا اور بلوغ کو پہنچی ہوئی تہذیب موجود تھی جس میں زراعت سب سے بڑا پیشہ تھا۔ اس کے علاوہ اس بستی میں اینٹیں اور برتن بنانا، مٹی سے مہریں اور سکے بنانا دوسرے نمایاں پیشے تھے۔

بستی آباد تھی، زندگی اپنی غمی خوشی کے ساتھ رواں دواں تھی۔ کھیت کھلیان لہلہا رہے تھے اور کوئی خاص مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ محبتیں اور رومانس چل رہے تھے، بچے پیدا ہو رہے تھے لوگ مر رہے۔ پھر رفتہ رفتہ بڑے پانیوں کی مقدار گھٹنے لگی۔ سال بسال پانی خشک ہوتا رہا اور لوگ سخت فکر مند ہونے لگے۔ اور بالآخر بڑے پانی آنا بالکل بند ہو گئے اور دریا سفید ریت کے صحرا میں بدل گیا۔ کھیت سوکھ گئے اور جانور چارے اور پانی کی عدم فراہمی کی وجہ سے مرنے لگے۔ ایسی گھمبیر صورت حال میں لوگ بستی چھوڑنے لگے اور بالکل آخر میں اس ناول کی ہیروئن، پاروشنی بستی میں رہ جاتی ہے اور اپنے کنک کے دانے نکال کر کچھ سنبھالتی ہے اور کچھ کوٹنے لگتی ہے۔ پاروشنی پر امید رہتی ہے کہ بڑے پانی کبھی نا کبھی آجائیں گے اور یہ بستی پھر سے آباد ہو گی۔

اس طرح پاروشنی زندگی اور امید کا استعارہ بن جاتی ہے۔

کلیدی الفاظ: بہاؤ، سرسوتی، تہذیب، زراعت، اجتماعی زندگی، مذہبی اعتقادات،، معدوم، پاروشنی، کھیتی باڑی، صحرا